سائنسی ترقی کا نصب العین

عہد حاضر کا ایک بنیادی مسئلہ

ڈاکٹر جمیل جالبی ٥

سائنسی ترقی کا نصب العین' اس دور کا ایک اہم اخلاقی سوال ہے۔ یہ ترقی جس تہذیبی پس منظر میں ہوئی ہے' اس کی جھلک ناگزیر طور پر اس ترقی کی سمت اور اس کے اچھے اور برے ثمرات میں نظر آتی ہے۔ ایک بے خدا تہذیب کے لیے اخلاقی حوالہ چنداں اہمیت نہیں رکھتا' لیکن جب انسان کو حقیقت کی دنیا میں مسائل سے واسطہ پیش آتا ہے تو اخلاقی حوالے سے مفر نہیں۔
سائنس اور اخلاقیات پر مغرب میں بہت کچھ لکھا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے بھی کچھ مسائل اٹھائے ہیں' لیکن کیا سائنس کی سہولتوں اور آسایشوں کی رسائی غریب و امیر تک یکساں کر دینے سے مسائل حل ہو جائیں گے؟ یہ اور دوسرے پیچیدہ سوالات کا صحیح جواب' انسان کا کائنات میں اپنا حقیقی مقام پہچاننے پر منحصر ہے۔ بہرحال' ان موضوعات پر بحث کی ضرورت ہے۔ (مدیر)

یہ سوال ربع صدی سے مجھے مسلسل پریشان کر رہا ہے کہ اس دور میں جب سائنس اور ٹکنالوجی نے دنیا کے منظر کو بالکل بدل دیا ہے' آخر اہل دانش یہ سوال کیوں نہیں اٹھا رہے ہیں کہ اس تبدیلی کے پیچھے کیا کوئی ایسا بڑا مقصد یا آدرش بھی ہے جس سے انسانی مساوات اور انصاف کے راستے' یکساں طور پر' عوام و خواص سب کے لیے کھل جائیں اور سرمایہ داروں کی سفاکانہ ہوس زر میں اعتدال پیدا ہو جائے؟ یہ سائنسی دور کی اخلاقیات کا پہلا اور سب سے بڑا سوال ہے۔ ۱۹۷۵ میں' میں نے لکھا تھا:

---

٥ سابق صدر نشین مقتدرہ قومی زبان' سابق وائس چانسلر جامعہ کراچی

سترھویں صدی میں جب "مغرب" نے نشات ثانیہ کے دور میں ترقی کا راستہ اختیار کیا تھا تو اس نے سارے اخلاقی بندھن توڑ کر "لامحدود تفتیش اور تحقیق کی مکمل آزادی" کا نظریہ اپنا لیا تھا۔ یہ مغرب کا شعوری فیصلہ تھا۔ "تحقیق" کی اس مکمل آزادی کے تصور کو پروان چڑھانے کے لیے ضروری تھا کہ وہ ہر اخلاقی نظام سے خود کو کاٹ کر الگ کر لے۔ جب مغرب نے ایسا کیا تو سائنسی ایجادات اور نئی نئی دریافتوں کا راستہ تو کھل گیا لیکن اس کے ساتھ خیر و شر کے سارے امتیازات بھی اٹھ گئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ رفتہ رفتہ علم اور سائنس کی ایجادات سے پیدا ہونے والی طاقت ایک ایسے سیاسی شخص کے ہاتھ میں آگئی جس کی اخلاقی تعلیم صفر کے برابر تھی (**مشرق کا المیہ**، ڈاکٹر جمیل جالبی، مشمولہ "نئی تنقید"، ص ۲۹۰-۲۹۱، کراچی ۱۹۸۵)۔

ایک ایسی دنیا میں، جہاں عام انسانی سطح پر، سماجی انصاف کا تصور بے معنی ہو اور جہاں آزاد منڈی کی معیشت، نئے عالمی نظام کے طور پر تیزی سے پھیل اور پھیلائی جا رہی ہو، حرص و طمع اور اسلحات کا بے محابہ استعمال اسی طرح عام ہو جائے گا جس طرح آج اس سمٹتی سکڑتی دنیا میں ہر طرف نظر آ رہا ہے، جس میں پسماندہ ممالک، سفاک استحصال کا بری طرح شکار ہو رہے ہیں اور ان کی قومی معیشت سے تیار ہونے والا حلوہ مغربی اقوام ہڑپ کر رہی ہیں اور سب کچھ قومی مفاد اور انصاف کے نام پر ہو رہا ہے۔

آج تک انسانی تاریخ میں جتنے نظام آئے اور اس نظام سے جو "فکر" ابھری اور پھیلی اس میں سماجی و معاشی جبر و استحصال کو ختم کر کے انصاف و مساوات کے فلاحی تصور کو پیش کیا گیا تھا۔ سارے مذاہب کی مقبولیت کا راز بھی یہی تھا کہ انھوں نے اپنے دور میں عدل و مساوات کا وہ تصور پیش کیا جو یکساں طور پر غریب و امیر، عوام و خواص سب کے لیے تھا۔ سائنس بھی، انسانی سطح پر، اسی وقت مفید ہو سکتی ہے جب وہ بھی دولت کی منصفانہ تقسیم سے معاشی و معاشرتی عدم مساوات کو دور کرے، لیکن یہی کام سائنس انجام نہیں دے رہی ہے۔

موجودہ صورت حال یہ ہے کہ جدید ٹکنالوجی، نئی نئی مشینوں اور کمپیوٹروں کے ذریعے فیکٹریوں اور دفتروں میں کام کرنے والوں کی جگہ لے رہی ہے، تیزی سے اسٹاک ہولڈر، انتہائی دولت مند ہو رہے ہیں اور اس دولت کو پیدا کرنے والے کارندے غریب و بے روزگار ہو رہے ہیں۔ چاروں طرف بے روزگاری کا عفریت منہ پھاڑے بے روزگار نوجوانوں کو ہڑپ کر رہا ہے۔ ایشیا، لاطینی امریکہ، افریقہ وغیرہ معاشی بدحالی کے منہ میں پھنسے ہوئے ہیں اور دولت کی تقسیم میں عدم مساوات روز بروز تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ لوہے کے سوداگر (اسلحہ فروش) اس انتشار کی فضا میں خوب دولت بٹور رہے ہیں۔ جس "سوداگر ملک یا قوم" کے تصرف میں یہ ٹکنالوجی ہوتی ہے وہ ساری دنیا پر چھا جاتا ہے۔ سائنس کے اس دور میں وہ ٹکنالوجی موثر و

کامیاب ہے جو منافع خوری کے عمل کو آگے بڑھائے۔ ہر جدید ٹکنالوجی کی کامیابی یا ناکامیابی کا یہی واحد معیار ہے۔

اس صورت حال میں جب ٹکنالوجی، ہر اخلاقی قدر سے آزاد ہو کر، ۱۰۰ فی صد منافع خور و سفاک سرمایہ دار کے ہاتھ میں آگئی ہے، کیا یہی وہ کام ہے جو ہمیں سائنس و ٹکنالوجی سے لینا چاہیے؟ سوچنے اور دیکھنے کی بات یہ ہے کہ آنے والے دور میں، عالم انسانیت پر، اس کے کیا اثرات مرتب ہوں گے؟

سائنس و ٹکنالوجی کے آغاز میں، بلکہ انیسویں صدی اور بیسویں صدی کے نصف تک، سائنس نے جو کام کیے اس سے عام و خاص کو یکساں طور پر فائدہ پہنچا۔ سائیکل، موٹر سائیکل، ریلوے، بسیں، موٹریں، ٹیلی فون، ریفریجریٹر، ریڈیو، ٹیلی وژن، ویکسین، اینٹی بائیوٹک، وٹامن، بجلی وغیرہ نے عام انسانی زندگی کو بدلا اور متاثر کیا اور خاص و عام کے فرق کو کم کیا۔ اس سے سب یکساں طور پر مستفیض ہوئے۔ قیمتیں بھی اتنی کم رکھی جاتی تھیں کہ وہ سب اشیا ہر شخص کی دست رس میں آسکیں۔ سب کو یکساں طور پر فائدہ پہنچانے کا یہ رجحان دوسری جنگ عظیم (۱۹۳۹-۱۹۴۵) کے بعد بدلنے لگا۔

ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم سے حملے (۱۹۴۵) کے بعد "جوہری انشقاق ری ایکٹر" (Nuclear Fission Reactor) کا استعمال، بجلی و توانائی پیدا کرنے کے لیے، شروع ہوا اور اس نے بھی ساری انسانیت کو فائدہ پہنچایا۔ اس دریافت سے بہت سی ایسی مشینیں وجود میں آئیں جن سے بیماریوں کے علاج میں موثر طور پر کام لیا جا سکتا تھا۔ مثلاً "ٹرائی گا" (Triga) کے نام سے ایسی جوہری مشین تیار ہوئی جس سے، مرض کی تشخیص کے لیے، آئی سو ٹوپس (isotopes) تیار کیے جا سکتے تھے۔ لیکن اسی کے ساتھ منافع خوری کا وہ رجحان پیدا ہوا جو اب تک کی ایجادات سے پیدا نہیں ہوا تھا۔ بے حد قیمتی ہونے کی وجہ سے "ٹرائی گا" صرف بہت بڑے ہسپتال ہی استعمال کر سکتے تھے۔ اس مشین کے فائدے عام اور غریب آدمی کے لیے نہیں تھے، جب کہ بیماری امیر و غریب کو دیکھ کر نہیں آتی۔ اس رجحان کے ساتھ، سائنس اور ٹکنالوجی کی سطح پر، عوام و خواص کے درمیان فاصلہ بڑھنے لگا۔ آج سائنس اور ٹکنالوجی کا رخ اسی منافع خوری کی طرف ہے۔

اب "سی اے ڈی، سی اے ایم" (Computer Aided Design and Computer Aided Manufacturing) کی حکمرانی کا دور آیا ہے۔ یہ ٹکنالوجی جوہری توانائی کے بعد کی نسل سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کی مدد سے سرمایہ داروں اور صنعت کاروں کا کاروبار چمک اٹھا ہے۔ اب ہاتھ سے کام کرنے والے کارندوں کی سرے سے ضرورت ہی باقی نہیں رہی ہے۔ اس انتہائی مہنگی ٹکنالوجی (سی اے ڈی، سی اے ایم) کو اب بڑے بڑے صنعت کار اپنی فیکٹریوں میں استعمال کر کے دولت مند طبقہ خواص سے خوب

دولت بٹور رہے ہیں۔

سائنس دان یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ مستقبل قریب میں "سی اے ایس، سی اے آر" (Computer Aided Selection and Computer Aided Reproduction) سوفٹ ویئر کی مدد سے ہمارے پوتے پڑپوتے اپنے پالتو جانور، مثلاً کتے، بلیوں وغیرہ کو اپنی مرضی و پسند کے مطابق وجود بخش سکیں گے اور اپنے جانور کو اپنی پسند کے رنگوں کے مطابق ڈیزائن کر سکیں گے۔ یہی نہیں بلکہ اس کے طرز عمل کو بھی ڈیزائن کر سکیں گے اور پھر اس ڈیزائن کو برقیاتی طور پر، مصنوعی زرخیز کاری تجربہ گاہ (fertilization laboratory) میں بھیج کر ۱۲ ہفتے بعد اپنا مطلوبہ جانور حاصل کر لیں گے جس کی گارنٹی سوفٹ ویئر کمپنی دے گی۔

اسکاٹ لینڈ کے ایک سائنس دان نے، "ڈولی" نام کی جو بھیڑ پیدا کی تھی، اس کی خبریں ہم اپنے اخباروں میں پڑھ چکے ہیں۔ ۲۴ جنوری ۱۹۹۸ کے اخبار ڈان میں یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ امریکہ میں ایسے دو بچھڑے "جارج" اور "چارلی" پیدا کیے گئے ہیں جن کے دودھ کے بارے میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ اس میں انسان کے لیے شفا بخش اور صحت افزا لحمییے (پروٹین) موجود ہیں۔ پچھلے دنوں ایک رسالے میں، میں نے ایک خاتون کا خط پڑھا جنھوں نے ایسے جانوروں کی پیدائش کا محرک بننے والے سائنس دانوں کو آڑے ہاتھوں لیا تھا اور کہا تھا کہ یہ سب لوگ ایسے ظالم ہیں کہ جانوروں کے ساتھ بے رحمی کا سلوک کر رہے ہیں۔ لیکن اب تو اس بات کا بھی دعویٰ کیا جا رہا ہے کہ جب "سی اے ایس، سی اے آر" (CAS-CAR) سوفٹ ویئر ملنے لگے گا تو سائنس دان ایسا کتا بنانے میں کامیاب ہو جائیں گے جس کے جسم پر جامنی اور بسنتی رنگ ہوں گے اور جو مرغے کی طرح بانگ دیتا ہو گا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم حد فاصل کہاں قائم کریں؟ کیا ہم سائنس اور ٹکنالوجی کو اپنی مرضی کے جانور یا اپنی مرضی کے عفریت (dragon) پیدا کرنے کی اجازت دیں گے؟ یہیں سے سماجی و انسانی اخلاق کا ایک بنیادی سوال پیدا ہوتا ہے اور یہ وہ سوال ہے جس کا جواب ہمارے پوتوں کو تلاش کرنا ہو گا۔ اگر عالم انسانیت نے اپنی مرضی کے کتے، بلی پیدا کرنے کی اجازت دے دی تو کیا ہمارے پڑپوتے "سی اے ایس، سی اے آر" (CAS - CAR) کی مدد سے اپنی مرضی کے اپنے بچے ڈیزائن کرنے سے باز رہیں گے؟ اس سے قبل کہ ہمارے پوتے یہ کام کریں، ہمیں پوری احتیاط کے ساتھ اس کے نتائج پر غور و فکر کرنا چاہیے اور یہ بھی سوچنا چاہیے کہ ہم سائنس و ٹکنالوجی کا رخ کس سمت میں موڑیں، کہ جہاں سے انسانی فلاح اور خیر کا عمل پروان چڑھے، عدم مساوات ختم ہو اور جبر و استحصال کا خاتمہ ہو۔

سائنس سے "شر" اس وقت پیدا ہو گا جب وہ صرف اور صرف مال دار طبقہ خواص کے لیے،

ٹکنالوجی کی مدد سے' تیار کی ہوئی سہولتیں' کھلونے کے طور پر' پیش کرے گی اور "خیر" اس وقت پیدا ہو گا جب وہ غریبوں کے لیے بھی ضروریات زندگی فراہم کرنے کا کام کرے گی۔ مستحسن صورت یہ ہے کہ سائنس تمام عالم انسانیت کے لیے کار آمد' ضروری اور مفید اشیا بنا کر انھیں ایسی قیمت پر فروخت کرے کہ وہ عام آدمی کی دسترس میں بھی آ جائیں۔ "ٹرائی گا" (Triga) کے فوائد سے صرف مال دار طبقہ فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ جدید ترین علاج صرف اور صرف امیر آدمی کی دسترس میں ہے۔ پسماندہ ممالک میں تو پیٹ بھر روٹی بھی سب کو میسر نہیں ہے۔ اکثریت کم خوری کی وجہ سے' طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہے۔ ایشیا اور افریقہ کی کثیر آبادی اسی عذاب میں مبتلا ہے۔ خود امریکہ میں بھی' جہاں علاج عام آدمی کی دسترس سے باہر ہے' بیماریاں اور اخلاقی کجی سڑکوں پر چلتی پھرتی نظر آتی ہیں۔ غریبوں کی ضروریات میں نہ صرف کھانا' سر چھپانے کو جگہ' بلکہ صحت اور سفری سہولتیں بھی شامل ہیں۔

بیسویں صدی کے خاتمے پر' غریب اور امیر سب کو' یکساں طور پر فائدہ پہنچانے میں' سائنس کی ناکامی کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ آج "خالص سائنس دان" تو عالم انسانیت کی عام ضروریات سے بے نیاز ہو گئے ہیں اور ان کے برعکس "اطلاقی سائنس دان" فوری منافع کمانے میں لگ گئے ہیں۔ چونکہ تحقیق کے کاموں کو مالیات فراہم کرنے کا کام کمیٹیوں کے ہاتھ میں ہوتا ہے جن کے ارباب حل و عقد بڑی بڑی کمپنیوں کے اعلیٰ ترین عہدے دار ہوتے ہیں' اسی لیے وہ ایسی تحقیقات کو مالیات فراہم کرتے ہیں جنھیں مال دار طبقہ' جس میں وہ خود بھی شامل ہیں' مہنگے سے مہنگے داموں خرید سکے۔ جلد منافع خوری کے اس انداز فکر نے جدید سائنس کو مال دار طبقے کے ہاتھ میں یرغمال بنا دیا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان ترجیحات کو بدلا جائے تاکہ ایسی ٹکنالوجی کو فروغ دیا جا سکے جس سے غریبوں کو بھی یکساں طور پر فائدہ پہنچ سکے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب سائنس دانوں کے بنیادی اخلاقی اصول و معیار اور ان کا انداز نظر تبدیل ہو۔ بیسویں صدی میں جو خرابیاں' سائنسی ترقی کے طوفان سے' انسانی معاشرے میں پیدا ہوئی ہیں ان کا واحد حل یہ ہے کہ مساوات کے اخلاقی تصورات کو سائنسی فکر کے بطن میں داخل کیا جائے۔

اس وقت نئی طوفانی لہریں تین طرف سے اُٹھ رہی ہیں۔ ایک' "انفارمیشن" کی سطح پر جو کمپیوٹر اور "انگشتی حافظے" (digital memory) سے پیدا ہوئی ہیں۔ دوسرے' "بایو ٹکنالوجی" سے' جس کے اثرات' جو ابھی تو پورے طور پر سامنے نہیں آئے ہیں لیکن اکیسویں صدی میں جلد ظاہر ہو جائیں گے' جس کی بنیاد "ڈی این اے" (DNA) کے "تسلسل" (sequencing) اور "جینیاتی انجینیرنگ" (Genetic Engineering) پر قائم ہے۔ اور تیسرے' "عصبی ٹکنالوجی" (Neuro Technology) سے' جو اکیسویں صدی میں ذرا دیر سے سامنے آئے گی اور جس سے عصبی آلے (neuro sensors) کی مدد

سے انسانی جذبات کے اندرونی فعل اور انسانی شخصیت کو بدلا جا سکے گا۔ انسانی زندگی کے لیے یہ تینوں نئی ٹکنالوجیاں انتہائی خلل انگیز ہوں گی۔ سائنس دانوں کا دعویٰ ہے کہ وہ ان ٹکنالوجیوں کی مدد سے فیکٹریوں' کھیتوں اور دفتروں میں کام کرنے والوں کو اکتاہٹ' بوریت اور بیزاری سے نجات دلا سکیں گے۔ ان کی مدد سے جسم و دماغ کی پرانی بیماریوں کو دور کیا جا سکے گا۔ صورت حال یہ ہو گی کہ جن کے پاس یہ ٹکنالوجی ہو گی' دولت و طاقت بھی ان کے پاس ہو گی۔ یہ نئی ٹکنالوجیاں نہ صرف پرانی صنعتوں اور کارخانوں کو بند کرا دیں گی' بلکہ وہاں کام کرنے والوں کو بھی بے کار کر دیں گی۔ یہ ٹکنالوجیاں غریبوں سے صرف نظر کر کے صرف امیر طبقے کو فائدہ پہنچائیں گی اور اس عمل سے دولت کی تقسیم میں عدم مساوات شدت اختیار کرے گی۔ بالفرض اگر ان کا یہ اثر نہیں ہو گا تو بھی یہ ضرور ہو گا کہ یہ انسانی زندگی کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کریں گی۔ اس پر دنیا کے دانش وروں کو ابھی سے غور کرنا چاہیے۔

اس وقت ساری دنیا میں سب کے لیے سستے مکانات' صحت کی ارزاں نگہداشت اور اعلیٰ معیار کی حامل سستی تعلیم کی ضرورت ہے۔ اکیسویں صدی میں انسانی سماج کا یہ بنیادی مسئلہ ہو گا کہ کس طرح ان تین نئی ٹکنالوجیوں اور غریب لوگوں کی تین بنیادی ضروریات کے درمیان فاصلے کو دور کیا جائے۔ فی الوقت تو ٹکنالوجی سے بنیادی ضروریات کے درمیان فاصلہ مسلسل بڑھ رہا ہے۔ ابھی تک سائنس دانوں نے اس بات کی اہمیت کو نہیں سمجھا ہے اور وہ سترھویں صدی سے آزاد و خود مختار تحقیق میں لگے ہوئے ہیں۔ اگر سائنس نے دنیا کے غریبوں کو اسی طرح نظرانداز کیا اور فائدہ اسی طرح امیروں کو پہنچایا جاتا رہا تو اکیسویں صدی کے نصف آخر میں یہ غریب (لوگ اور ملک) جبر' ظلم اور استحصال کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیں گے اور جذباتی اور پرتشدد فیصلے کر کے دنیا کے سارے نظام کو درہم برہم کر دیں گے۔ امیر طبقہ شیشے کے گھر میں بیٹھا ہے' اور پتھر غریب (طبقے اور ملک) کے سامنے پڑے ہیں۔ بلاشبہ اس تشدد سے غریب' امیر تو نہیں ہو جائیں گے لیکن انسانی سماج ناآسودہ اور برباد ضرور ہو جائے گا۔ ممکن ہے غریب (لوگ اور ملک) ان خطرناک مشینوں ہی کو توڑ ڈالیں جن سے عدم مساوات جنم لے رہی ہے۔

ٹکنالوجی اور انسانی ضروریات کے درمیان یہ فاصلہ اُن اخلاقی اقدار سے ہی دور ہو سکے گا' جنھیں اہل دانش کو ابھی تلاش کرنا اور اہل سائنس کے ذہن نشین کرانا ہے۔ گذشتہ ۳۰ سال سے فضا کی آلودگی کو دور کرنے کے لیے عالمی سطح پر جو تحریک چلائی جا رہی ہے اس میں بنیادی طور پر اخلاقی قوت اور اخلاقی ترغیبات ہی کام آ رہی ہیں۔ امریکہ اور دوسرے ترقی یافتہ ممالک میں جوہری توانائی پر مبنی صنعتوں اور اسلحات کی بندش اسی کا نتیجہ ہے۔ یہ بات سب نے محسوس کی ہے کہ اخلاق کا ترغیبی اثر معاشیات و سیاسیات سے زیادہ طاقت ور ثابت ہوا ہے۔ ان اخلاقی ترغیبات کا صرف یہی کام نہیں ہونا چاہیے کہ اب تک ٹکنالوجی نے جو

فاش غلطیاں کی ہیں، ان کو دور کرے بلکہ سماجی انصاف کے عمل کو سب ترجیحات میں بلند ترین مقام پر قائم کرے۔ دنیا کے کروڑوں لوگوں کو ذریعہ معاش، روزگار کے ساتھ سر چھپانے کے لیے جگہ اور علاج معالجے کی سہولتیں فراہم کرنا بھی سائنس کے زمرۂ اخلاق میں شامل کیا جانا چاہیے۔ اور یہ سب چیزیں انھیں ان داموں پر فراہم کی جائیں جو وہ ادا کر سکیں۔ سفاک و جابر آزاد منڈی کی معیشت، جو اخلاقی قدروں سے یکسر عاری ہے، یہ کام اس لیے نہیں کر سکتی کہ اس کی بنیاد استحصال، لوٹ کھسوٹ، جبر اور ننگی جارحیت پر قائم ہے۔ لیکن یہ کام اس مثبت ٹکنالوجی سے لیا جا سکتا ہے جس کی راہنمائی، انسانی ضمیر میں بیٹھی ہوئی اخلاقی اقدار کر رہی ہیں۔ ایسی اخلاقی قدروں کو فروغ دینے کا کام معلومات کی فراہمی کے عہد اور میڈیا [ہمہ پہلو ذرائع ابلاغ] کے ذریعے اسی طرح کیا جا سکتا ہے جس طرح فضائی آلودگی سے دنیا کو بچانے کے لیے آغاز کیا گیا ہے۔

سماجی انصاف کے مقصد کو سب کا مشترک مقصد بنانے کے لیے، موجود مذاہب سے بھی بڑا اور اہم کام لیا جا سکتا ہے۔ مذہب نے فکری سطح پر اب تک سماجی انصاف کے نظام کو بحال رکھنے کی خدمت انجام دی ہے۔ انسانی ذہن آج بھی اس کے اثر میں ہے۔ اس اثر کو بھی نئی سائنسی اخلاقیات کی تشکیل و فروغ کے لیے استعمال کیا جانا چاہیے۔ سائنس کے اس منفی رجحان کو، نئے سائنس دانوں کو، ایک چیلنج کے طور پر قبول کرنا چاہیے۔

یہ تو میں نے صرف تین ٹکنالوجیوں کی بات کی ہے۔ ابھی تک علم حیاتیات کو پوری طرح نہیں سمجھا گیا۔ سائنس دانوں نے اس پہلو پر بھی پوری طرح غور نہیں کیا ہے کہ کس طرح بچوں اور بڑوں میں سیکھنے سمجھنے کی صلاحیت کو بڑھایا جا سکتا ہے؟ کس طرح بوڑھا ہونے کے عمل کو روکا جا سکتا ہے؟ کس طرح ذہن کی کمزوریوں کو دور کیا جا سکتا ہے؟ اکیسویں صدی میں "حیاتیات" ان امور کو سمجھ کر ایسی ٹکنالوجی دریافت کرنے میں پیش رفت کرے گی جس سے انسانی المیوں کو روکنے اور انسانی حالت کو بہتر بنانے کا کام لیا جا سکے گا۔

آج کل ترقی یافتہ ممالک میں بایو ٹکنالوجی کے ذریعے نسل انسانی کو بہتر بنانے کی بحثیں ہو رہی ہیں۔ شکاگو یونی ورسٹی کے ڈاکٹر سیڈ کا بیان ہمارے اخباروں میں شائع ہو چکا ہے۔ موجودہ سائنسی ماحول میں ہم اسے پسند کریں یا نہ کریں--- نسل انسانی کو بہتر بنانے کے تصور کو، عملی جامہ پہنانے کا کام، ہو کر رہے گا۔ جب بھی لوگوں کو ان کے بچوں کو بہتر بنانے کی دعوت دی جائے گی وہ بخوشی اسے قبول کریں گے۔ بہتر بنانے کے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ ان کے بچوں کی صحت کو، بایو ٹکنالوجی تکنیک سے، بہتر بنا دیا جائے۔ ان کی صحت اور صلاحیت کار کو بڑھا دیا جائے۔ ان کو خوش مزاج بنا دیا جائے۔ ان کے دل کو اتنا مضبوط بنا دیا جائے

کہ وہ کبھی دل کی بیماری میں مبتلا نہ ہو سکیں۔ سرطان کو، بچے کی زندگی سے، ہمیشہ کے لیے نکال دیا جائے۔ ان کی ذہانت کو بڑھا دیا جائے۔ ایک کھلاڑی میں اتنی قوت پیدا کر دی جائے کہ وہ کامیاب ترین کھلاڑی بن جائے۔ ہر ماں باپ کی یہ خواہش ہو گی کہ ان کا بچہ ہر بیماری سے محفوظ رہے، طویل عمر پائے، کامیاب اور خوش مزاج ہو، ذہانت میں سب سے آگے اور صلاحیتوں کے اعتبار سے سب سے اعلیٰ ہو۔ اس ٹکنالوجی کو قانون کے ذریعے روکا تو جا سکتا ہے لیکن اسے ہمیشہ کے لیے دبا کر رکھنا ممکن نہیں ہو گا۔ اسقاط حمل کا قانون تو موجود ہے لیکن اس کے باوجود یہ کام ساری دنیا میں ہو رہا ہے۔ آنے والے زمانے میں ہزاروں لاکھوں افراد، نسل انسانی کو بہتر بنانے کے عمل کو قانوناً روکنے پر احتجاج کریں گے۔ اسے ناانصافی اور ریاستی جبر قرار دیں گے اور وہ کریں گے جو وہ کرنا چاہتے ہیں۔

حیاتیاتی سائنس کی ترقی سے، اکیسویں صدی میں، پرانے مذہبی، سماجی، تہذیبی، طبی، قانونی اداروں اور اس خواہش میں کہ ان کے بچے بہترین صلاحیتوں سے ہم کنار ہوں، تصادم اور آویزش کا عمل شروع ہو گا۔ پرانے ادارے اس خواہش کے پر قینچ کریں گے [پر کاٹنا] لیکن یہ سلسلہ اس لیے نہیں رک سکے گا کہ انسانی خواہشات کے، ہمیشہ کے لیے پر کاٹ دینا ممکن نہیں ہوتا۔

پھر کیا ہو گا؟ کوئی پیش گوئی کرنا تو مشکل ہے لیکن وہ حکایت تو سنائی ہی جا سکتی ہے جو تذکرہ غوثیہ میں آئی ہے کہ: حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ایک دوست تھا، مگر نادان۔ اس نے حضرت سے درخواست کی کہ مجھے "اسم اعظم" سکھا دیجیے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے انکار کیا اور سمجھایا کہ تو اس قابل نہیں ہے لیکن وہ نہ مانا اور اصرار کرتا رہا۔ مجبور ہو کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اسے "اسم اعظم" سکھا کر امتحان بھی کرا دیا لیکن اسے منع بھی فرمایا کہ آیندہ اسے کام میں نہ لانا ورنہ اچھا نہ ہو گا۔ یہ فرما کر وہ روانہ ہو گئے۔ ان کے چلے جانے کے بعد اس شخص کے دل میں آیا کہ بھلا دیکھوں تو "اسم اعظم" اب بھی تاثیر کرتا ہے یا نہیں۔ کچھ فاصلے پر اسے ہڈیاں نظر آئیں۔ اس نے "اسم اعظم" پڑھا۔ فوراً ایک خونخوار شیر زندہ ہو کر غرایا اور اس کو پھاڑ کھایا۔ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام واپس ہوئے تو دیکھا کہ وہ مرا ہوا پڑا ہے اور شیر اسے کھا رہا ہے۔ انھوں نے شیر سے پوچھا کہ: "تو نے اسے کیوں مارا، اس نے تو تجھے زندہ کیا تھا؟" شیر نے جواب دیا: "بے شک یہ شخص میرا خالق تھا مگر اس نے میرے رزق کی فکر نہ کی۔ اس لیے میں نے اسے کھا لیا---!"

صاحبو! یہی صورت سائنس کے ساتھ ہو گی۔ اگر اس نے غریبوں (لوگ اور ملک) کی فکر نہ کی تو سائنس کا شیر ساری انسانیت کو پھاڑ کھائے گا۔